© rasailojaraid.com

جان سلومپ

انگریزی سے ترجمہ: ادارہ

یورپ میں مسلم - مسیحی روابط

[وطنِ عزیز میں مسلم - مسیحی مکالمے سے دلچسپی رکھنے والے حلقوں میں جناب جان سلومپ کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ گزشتہ سال ۱۷ جنوری کو اُنھوں نے ادارہ ثقافت اسلامیہ - لاہور کی دعوت پر یورپ میں تیزی سے بڑھتی ہوئی مسلم آبادی اور مقامی مسیحی اکثریت کے باہمی روابط پر گفتگو کی تھی جو ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کے مجلّہ "المعارف" (بابت اپریل - جون ۱۹۹۷ء) میں بزبان انگریزی شائع ہوئی ہے۔ ہم ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کے ڈائریکٹر اور مجلّہ "المعارف" کے مدیرِ اعلیٰ ڈاکٹر رشید احمد جالندھری کے ممنون ہیں کہ اُنھوں نے ہمیں جان سلومپ کے افکار کو اُردو کا جامہ پہنانے کا موقع دیا ہے۔ گفتگو کے خاتمے پر حواشی کا اضافہ ہماری جانب سے ہے۔ مدیر]

آپ کے مہمان کی حیثیت سے پاکستان واپس آنا میرے لیے ازحد مسرّت اور عزت افزائی کی بات ہے۔ میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے موقع فراہم کیا ہے کہ مسلم - مسیحی مکالمے کے بارے میں آپ سے اپنے تجربات کا ذکر اور خیالات کا تبادلہ کر سکوں۔ تقریباً دو برس پہلے دیرینہ کرم فرما ڈاکٹر رشید احمد جالندھری، ڈائریکٹر ادارہ ثقافتِ اسلامیہ - لاہور نے اپنے ایک خط میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ جب آئندہ میں پاکستان آؤں تو اس کتاب کے بارے میں ایک لیکچر دوں جو نیدرلینڈز کے "ریفارمڈ چرچ" کے "شعبۂ اسلام" سے میری سبکدوشی پر میرے اعزاز میں مرتّب کی گئی تھی۔ Muslims and Christians in Europe (یورپ میں مسلمان اور مسیحی) اِس کتاب کا عنوان ہے، اور Breaking New Ground (افہام و تفہیم میں پیش رفت) اس کا ذیلی عنوان ہے[1]۔ دو مسلمانوں دوستوں نے اِس کے لیے مضامین لکھے۔ ان میں سے ایک آسٹریا کے ڈاکٹر شمائل بالچ ہیں جن سے میری پہلی ملاقات راولپنڈی اور لاہور میں "پہلی بین الاقوامی سیرت کانگرس" (۱۹۷۶ء) کے موقع پر ہوئی تھی۔ دوسرے دوست جناب عبدالواحد فان بومیل ہیں جو ایک فعّال اور بہت لکھنے والے ڈچ مسلمان ہیں۔ اِس پس منظر میں آج کا لیکچر ایک حد تک سوانحی نوعیت کا ہوگا۔ معذرتاً میں یہ بات آپ کے سامنے کہنا چاہتا ہوں کہ سالِ رواں کے آخر میں سرکاری کاغذات کے مطابق میری عمر ملازمت سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ریٹائرمنٹ کی حد کو پہنچ جائے گی، اور اس لیے ذرا پیچھے مڑ کر دیکھنے کے موڈ میں ہوں۔

یورپ میں عموماً، اور نیدرلینڈز میں خصوصاً میرے کام کی بطور احسن انجام دہی ممکن نہ تھی، اگر میں سیکھنے کے اُس عمل سے نہ گزرا ہوتا جس کا موقع مجھے اپنے ۱۳ سالہ قیامِ پاکستان کے دوران میں ملا تھا۔ میں اُس دور کے اپنے پاکستانی اور دوسرے دوستوں، جن میں مسلمان اور مسیحی دونوں شامل ہیں، کا ازحد ممنون ہوں۔ آج جب میں آپ سے مخاطب ہوں، اُن میں سے بعض ہمارے درمیان نہیں، البتہ باقی ہنسی خوشی زندگی گزار رہے ہیں۔ میں یہ بات آغاز ہی میں صاف کر دینا چاہتا ہوں کہ میں آپ کو لیکچر دینے، یا یہ بتانے نہیں آیا کہ موجودہ صورت حال میں آپ کو کیا کرنا چاہیے۔ کم و بیش بیس برس کی غیر حاضری کے بعد میں اس پوزیشن ہی میں نہیں۔

میں اپنی سہ گانہ حیثیت سے گفتگو کروں گا۔ اولاً ۱۹۶۴ء اور ۱۹۷۷ء کے درمیان پاکستان میں کام کرنے والے ایک غیر ملکی مبشّر کی حیثیت سے، جس نے اُس دور میں بہت کچھ سیکھا اور نتیجتہً زندگی بھر کے لیے ہر جگہ اس ملک کا ایک خیر خواہ غیر ملازم سفیر بن گیا۔ ثانیاً اپنی اس حیثیت سے کہ یورپ کے سوادِ اعظم سے تعلق رکھنے والے ایک چرچ نے اپنے "شعبۂ اسلام" کا مجھے انچارج بنایا۔ کرسچین سٹڈی سنٹر - راولپنڈی میں میرے رفیقِ کار آنجہانی ڈاکٹر بارن ہیسٹر کو ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ایسا ہی منصب حاصل ہوا تھا۔ اس شعبۂ اسلام (اسلام ڈیسک) کا کام یہ تھا کہ یورپ کے عام مسیحیوں، چرچوں اور دوسرے لوگوں میں مسلمانوں اور اُن کے مذہب کے بارے میں معلومات عام کی جائیں۔ اب دُنیا کے اُس حصّے میں مسلمانوں کی آبادی ستر لاکھ سے زائد ہے اور نماز کی ادائیگی کے لیے مختص کمروں اور مساجد کی تعداد چھ ہزار کے لگ بھگ ہے۔ نیدرلینڈز میں ایسی جگہیں ۳۴۰ ہیں۔ بلاشبہ مسلمانوں کی اس تعداد میں موجودگی ہر سطح پر اُن سے تعاون کا تقاضا کرتی تھی۔ میں ایک مثال دیتا ہوں۔ جب مجھے نیدرلینڈز کے "ریفارمڈ چرچز" کی اعلیٰ ترین مجلسِ حاکمہ یعنی جنرل سنڈ (general synod) میں اپنی سرگرمیوں کی رپورٹ پیش کرنا پڑی تو اس معزز اجتماع کو خطاب کرنے کے لیے ایک مسلمان خاتون کو دعوت دی گئی تھی۔ یہ حقیقت باہمی اعتماد کی ایک علامت ہے کہ مجھے "جرنل آف دی انسٹی ٹیوٹ آف مسلم مائنارٹی افیئرز" (جدہ/لندن) کی مجلسِ ادارت کی رکنیت پیش کی گئی۔ ثالثاً میں اسلام کے ایک مخلص، نہ کہ بے تعلق، طالب علم کی حیثیت سے گفتگو کروں گا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مغربی مبشّرین کا زیادہ تر انحصار اُن لوگوں کی کتابوں پر ہے جنھیں "مستشرقین" کہا جاتا ہے۔ میں "مستشرقین" کا لفظ کسی منفی انداز میں استعمال نہیں کر رہا۔ بہر حال ان لوگوں نے اسلام کے بنیادی ماخذوں کی اشاعت اور ترجمہ کر کے اسلام کی بڑی خدمت کی ہے، اور اتنے بُرے بھی نہیں تھے جتنا ہمیں ایڈورڈ سعید[2] اور طیباوی[3] باور کرانا چاہتے ہیں۔ ڈبلیو - مانٹگمری واٹ نے اُن کا دفاع کیا ہے[4]، تاہم میں نے اِسے اپنا فرض خیال کیا کہ خود مسلم فضلاء کی کتابوں کا اگر ممکن ہو تو اُن کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اصل زبانوں میں مطالعہ کیا جائے۔ برصغیر پاکستان وہند کے حوالے سے میں سر سید احمد خان، شاعرو فلسفی محمد اقبال، مولانا مودودی اور بہت سے دوسرے اہل علم کا ذکر کروں گا۔

میں نے اپنا ذکر ایک سابق مبشّر (مشنری) کے طور پر کیا ہے، کیونکہ میں اپنے لیے اس اصطلاح یا نام کے استعمال میں کوئی شرم محسوس نہیں کرتا۔ ایک مشنری کو، چاہے اُس کا کوئی مذہب ہو، ایسا شخص سمجھا جاتا ہے جو اخلاص اور مقصد زندگی کا حامل ہوتا ہے۔ ۱۹۸۶ء میں ایک جرمن ماہر الہیات کلاس ہوک (Klaus Hock) نے ایک مقالہ Westlicher theologie (اسلام: مغربی الہیات کے آئینے میں) Der Islam im Spiegel شائع کیا۔ اُس نے اس مقالے میں اسلام کے بارے میں یورپ کے مسیحی افکار کا جائزہ لیا ہے۔ مقالے کے ایک باب میں مصنّف نے اسلام کے بارے میں میرے خیالات کے بارے میں بھی لکھا اور اسے "مسلمانوں کے لیے مشن (Islammission) کا خاتمہ؟ یا تبدیلیٔ مذہب کے ارادے کے بجائے مکالمہ" کا عنوان دیا۔ "مسلمانوں کے لیے مشن کا خاتمہ؟" کے آخر میں سوالیہ نشان ڈاکٹر ہوک نے لگایا۔ میں کلیساؤں کی اُن قدیم روایتی تبشیری کاوشوں کے خاتمے کے لیے بحث کرتا ہوں جن کا بنیادی مقصد مسلمان افراد کو حلقۂ مسیحیت میں شامل کرنا ہے۔ مسلمانوں کے لیے مشن کا یہ ذہن اسلام کے بارے میں اکثر اس نقطۂ نظر پر مبنی تھا/ ہے کہ اسلام ایک گھٹیا، ناقص اور خام دین ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کے لیے "چرچ کے نئے مشن"، جو ماضی سے بہت زیادہ مختلف ہے، کا ایک [نیا] ایجنڈا ہے جو ماضی کی نسبت چھوٹا نہیں، بلکہ کچھ بڑا ہے۔ "جو کام کیے جانے چاہییں،" میرا یہ بیان اُن کی طویل فہرستوں پر مبنی ہے، اور یہ فہرستیں ۱۹۵۰ء کے عشرے سے جاری دونوں مذاہب کے نمائندوں کے باہمی تبادلۂ خیال سے وجود میں آئی ہیں۔ ہم مسلمانوں اور مسیحیوں نے اِن مقدّس عزائم کو عملی جامہ پہنانا، بس شروع ہی کیا ہے۔

خود میری زندگی میں یہ تبدیلی کیسے آئی؟ [اس سوال کے جواب میں] کتابوں سے اقتباسات اور بیانات نقل کرنے کے بجائے میں ایک روایتی مبشّر سے اسلام کے بارے میں مکالماتی اندازِ نظر اختیار کرنے کی اپنی "ماہیت قلب" پیش کرنے کو ترجیح دوں گا۔ میرے رویّے میں یہ تبدیلی سراسر پاکستان میں میرے کام کی بدولت آئی۔ اس کہانی کا تعلق لاہور سے ہے۔ پاکستان آنے سے پہلے، اگر مجھے صحیح طور پر یاد ہے تو ۱۹۶۳ء میں، لاہور میں مقیم ایک پریسبیٹرین مبشّر جم گٹنگز (Jim Gittings) کا لکھا ہوا ایک کتابچہ On Loving Islam نظر سے گزرا۔ اس کتابچے کا سارا زور اس بات پر تھا کہ اسلام جو پاکستان کے زیادہ تر شہریوں کو اپنی جانوں سے زیادہ عزیز ہے، اس کے بارے میں ایک حد تک ہمدردی، بلکہ محبت، رکھے بغیر مسلمانوں کے لیے مسیحی مشن کی ناکامی لازمی اور یقینی ہے۔ دوسرے لفظوں میں مسیحیوں کو اسلام اور اپنی حیرت انگیز مسیحیت کے درمیان غیر تنقیدی تقابل کے وقت،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اپنے ذہنی تناظر کی رُو سے، مسلمانوں اور اُن کے مذہب کی کوتاہیوں پر زور دینے سے اب باز آ جانا چاہیے۔ یہ غلطی عام طور پر کی جاتی ہے کہ اپنے آئیڈیل کے ساتھ دوسرے کی کمزوریوں کا مقابلہ کیا جاتا ہے۔ میری "قلبِ ماہیّت" کا دوسرا سبب لونلاہال کے ڈائریکٹر آنجہانی ڈاکٹر رابرٹ - اے - بٹلر تھے۔ جب ہم ساہیوال میں مقیم تھے تو میں اُن کی وسیع لائبریری سے اکثر استفادہ کرتا تھا۔ مزید براں ڈاکٹر بٹلر اور میں نے "ویسٹ پاکستان کرسچین کونسل" کی "مطالعاتی کمیٹی" میں اکٹھے کام کیا، ہم اسے "اسلامک کمیٹی" کہا کرتے تھے۔ اِس کمیٹی کے کام کے جو نتائج سامنے آئے، اِن میں سے ایک راولپنڈی میں کرسچین سٹڈی سنٹر کا قیام تھا۔ ۱۹۶۶ء میں ہماری کمیٹی کے ایک اجلاس میں، ڈاکٹر بٹلر نے اپنا ایک مضمون "Declaration of the Second Vatican Council on the Non-Christian Religions" (دوسری ویٹی کن کونسل کا غیر مسیحی مذاہب کے بارے میں اعلان) تقسیم کیا۔ یہ متن خوش قسمتی سے Trying to Respond[5] (--- جواب میں) نامی کتاب کے سولہویں باب کے طور پر دوبارہ چھپ گیا ہے۔ یہ کتاب ڈاکٹر بٹلر کی اہم ترین تحریروں پر مشتمل ہے جنھیں محمد اکرام چغتائی نے مرتّب کیا ہے۔ ڈاکٹر بٹلر کے مضمون میں مسلمانوں اور اسلام کے بارے میں کسی بھی چرچ کی جانب سے جاری کردہ پہلے مثبت سرکاری بیان کا متن شامل ہے، البتہ یہ اس اعلان سے واضح طور پر متضاد ہے جو جنوبی افریقہ میں ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا۔ جنوبی افریقہ کے اعلان میں اسلام کو ایک جھوٹا مذہب قرار دیا گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اکتوبر ۱۹۶۵ء کے اعلانِ ویٹی کن کے مندرجات سے آپ سب آگاہ ہیں۔ محض یادداشت تازہ کرنے کے لیے میں اِس کی چند سطریں پیش کرتا ہوں:

> چرچ مسلمانوں کو بھی عزت و توقیر کی نگاہ سے دیکھتا ہے، وہ خدائے واحد کی عبادت کرتے ہیں جو حی و قیوم ہے، رحیم و قادر ہے، آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے، اور انسانوں سے خطاب کرنے والا ہے۔ وہ خدائے واحد کے احکام کی، چاہے وہ اُن کی سمجھ میں نہ آئیں، اُسی طرح دل و جان سے پیروی کرنے کی کوشش کرتے ہیں جیسے حضرت ابراہیم نے کی تھی، اور مسلمان حضرت ابراہیم سے اپنا دینی تعلق جوڑتے ہیں۔ اگرچہ وہ حضرت عیسیٰ کو خداوند کریم تسلیم نہیں کرتے، تاہم وہ بطور اُن کا پیغمبر احترام کرتے ہیں۔ وہ حضرت عیسیٰ کی والدہ مریم علیہا السلام کی عزت کرتے ہیں، اور بعض اوقات پورے انہماک سے اُن کا ذکر کرتے ہیں۔ مزید براں وہ روزِ جزاء کا انتظار کر رہے ہیں، جب اللہ ہر شخص کو زندہ کر کے اُسے اُس کی جزاء دے گا۔ وہ اخلاقی زندگی کو اہمیت دیتے ہیں اور خصوصاً دُعا، صدقہ و خیرات اور روزے کے ذریعے خداوند سے اظہارِ نیازمندی کرتے ہیں۔ اگرچہ صدیوں پر محیط تاریخ میں مسیحیوں اور مسلمانوں کے درمیان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

متعدّد جھگڑوں اور عداوتوں نے جنم لیا، تاہم یہ مقدّس ترین اجتماع (synod) مسیحیوں پر زور دیتا ہے کہ ماضی کو بھلا دیں اور پورے اخلاص سے ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ تمام بنی نوع انسان کے نام پر آپ اُنہیں امن و حرّیت، اخلاقی اقدار اور عدلِ اجتماعی کے تحفظ اور نشوونما کے مشترک مقصد کے لیے کام کرنے دیں۔

میں نے یہ اقتباس Trying to Respond کے بجائے ویٹی کن کونسل کے اعلان کے سرکاری ترجمے سے لیا ہے جو امریکہ سے شائع ہوا ہے۔ ڈاکٹر بٹلر نے اِس بیان پر ہم سے تبادلۂ خیال کیا اور مجھ پر اعلان کا بہت گہرا اثر ہوا۔ اگرچہ میں خود رومن کیتھولک نہیں، مگر مجھے اِس سے اتفاق ہے۔ اگر رومن کیتھولک برادری نے اس اعلان میں حضرت مریم علیہا السلام کے مقام پر زور نہ دیا ہوتا تو اِس متن کا پروٹسٹنٹ مسیحیوں کے لیے تسلیم کرنا نسبتاً آسان تر ہوتا۔ بہت سے مسلمانوں نے اِس اعلان کا خیر مقدم کیا، اگرچہ اُنہیں اس بات کا احساس رہا کہ حضرت محمد ﷺ اور اُن کے پیش کردہ مذہب اسلام کا نام نہیں لیا گیا، تاہم مسلمانوں نے وہاں قرآنی افکار کا تذکرہ محسوس کر لیا جہاں اعلان کا مسوّدہ لکھنے والوں نے بائبل کے متن کے حوالے دیے ہیں۔ اِس میں حضرت محمد کا منصبِ نبوت نام لیے بغیر تسلیم کر لیا گیا ہے۔

مارچ ۱۹۸۴ء میں دین و سیاست کے درمیان کامل تفریق کرنے والے یورپ میں مسلمانوں اور مسیحیوں کی شہادت خداوندی پر ایک بین الاقوامی مشاورت میں ہم نے اس فروگزاشت پر اِس انداز میں توجہ دی کہ مسیحی کیسے اور کس حد تک حضرت محمد ﷺ کی نبوت کو تسلیم کر سکتے ہیں؟ اِس مسئلے پر بحث تاحال جاری ہے، آئیے! لاہور کا ذکر جہاں چھوڑا تھا، وہیں سے پھر شروع کریں۔

کم و بیش ایک سال بعد ۱۹۶۷ء میں "ورلڈ کونسل آف چرچز" (جنیوا) کے زیرِ اہتمام کینڈی (سری لنکا) میں منعقدہ مکالمہ بین المذاہب کے دوسرے مشاورتی اجلاس میں شرکت کے بعد ہمارے ساتھ تبادلۂ خیال کی غرض سے ڈاکٹر جان ٹیلر لاہور تشریف لائے۔ لو ئلا ہال مسلمان اور مسیحی دوستوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ڈاکٹر ٹیلر نے کینڈی کے اجتماع کی بڑی پُرجوش رُوداد سنائی۔

کینڈی کے اجتماع میں شریک ہونے والوں نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی تھی کہ اُن کے نزدیک مکالمے سے کیا مراد ہے:

> مکالمے سے مراد ایک مثبت کاوش ہے جس میں ایک دوسرے کے یقین و ایمان کی باہمی آگاہی کے ذریعے صداقت کا عمیق فہم حاصل کیا جاتا ہے۔ اِس عمل میں یہ خواہش شامل ہوتی ہے کہ کوئی نئی بات وقوع پذیر ہو، یعنی کوئی ایسا رُخ سامنے آئے جس سے پہلے کوئی آگاہی نہیں۔ مکالمے میں اپنی رائے بدل لینا بھی اسی طرح شامل ہے جیسے مخاطب کو متاثر کرنا۔ اچھا مکالمہ اُس وقت بنتا ہے جب ایک فریق اِس طرح بات کرتا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے کہ دوسرا اپنے آپ کو سننے کے لیے آمادہ پاتا ہے، اور اسی طرح جب ایک سنتا ہے تو دوسرا بات کرنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ مکالمے کے نتائج "روح" کے ہاتھ میں ہیں۔

یقیناً یہاں "روح" سے مراد "روح القدس" ہے۔ یہ تصور بطور بنیاد کام کرے گا۔ ویٹی کن کا اعلان اور "ورلڈ کونسل آف چرچز" کی یہ مطبوعہ دستاویز (جسے سرکاری طور پر قبول نہیں کیا گیا)، دونوں بنیادی متون ایک مکمل پروگرام کے حامل ہیں۔ ۱۹۹۵ء میں مسیحی - مسلم روابط پر بیروت سے عربی میں شائع شدہ ۶۰ دستاویزات کے مجموعے کا مطالعہ بھی دلچسپی کا باعث ہوگا۔ اس مجموعے میں دُنیا بھر سے مسلمانوں اور مسیحی رہنماؤں کے وہ مشترک بیانات جمع کیے گئے ہیں جو اُنھوں نے باہمی دلچسپیوں اور کاموں کے بارے میں دیے ہیں، تاکہ دُنیا کو زندہ رہنے کے لیے مزید بہتر بنایا جائے۔ اِن دستاویزات کا انتخاب جو مسیحی اور مسلمان اہلِ علم نے مل کر کیا ہے، مشرقِ وسطیٰ کے تناظر میں ہے۔ اگر ایسا مجموعہ یا انتخاب یورپ میں مرتّب کیا جاتا، تو بیروت کے اس مجموعے سے کچھ مختلف ہوتا۔

دوسری ویٹی کن کونسل کے اعلان سے پہلے لوئی میسینوں کا مکتبِ فکر اسلام کے ساتھ بطور "مذہبِ ابراہیمی" انصاف کے لیے کوشاں تھا۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ یہ رویّہ اب بھی تسلسل کے ساتھ موجود ہے۔ یورپ اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں اِن کاوشوں سے پہلے قدیم تر مذہب یہودیت کی ازسرِ نو قدر و منزلت کے لیے کوششیں ہو چکی تھیں۔ مسلمانوں کے بارے میں ویٹی کن کونسل کے اعلان سے پہلے یہودیوں کے بارے میں اعلان سامنے آیا "جن سے چرچ نے عہد نامہ عتیق حاصل کیا ہے۔" شاید اسلام اور یہودیت کے درمیان مماثلتوں نے مسیحی فریق کو آمادہ کیا کہ یہودیوں اور مسلمانوں کے ساتھ مساوی سلوک روا رکھا جائے، لیکن یہ رویّہ فوراً سامنے نہیں آیا تھا۔ امریکہ اور یورپ میں عام لوگ اور چرچ جانے والوں کو جوں جوں جرمنی میں یہودیوں پر ہونے والے مظالم کی تفصیلات معلوم ہوئیں، اِسی طرح اُن کے دلوں میں اسرائیل اور یہودیوں کے لیے ہمدردی بڑھتی گئی۔ جو لوگ اسرائیل کے لیے ہمدردی کے جذبات رکھتے تھے، وہ عربوں کو، مسلمان ہوں یا مسیحی، دشمن سمجھتے تھے۔ خوش قسمتی سے قضیہ فلسطین کے بارے میں حالیہ پیش رفت کے نتیجے میں نسبتاً زیادہ متوازن رویّہ بنا ہے۔ اس سے خود چرچوں کے اندر تناؤ کی کیفیت ہے۔ اسی لیے ۱۹۷۳ء میں فرانس کے کیتھولک مسیحیوں کی تجویز تھی کہ اُن کے نئے قائم شدہ سیکرٹریٹ برائے اسلام کو اُن لوگوں کے ساتھ قریبی تعاون کرنا چاہیے جو یہودیوں کے ساتھ ربط رکھتے ہیں۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی "نیشنل کونسل آف چرچز" نے مسلمانوں اور یہودیوں کے ساتھ روابط کے لیے ایک شعبہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا، اِسی طرح کونسل آف چرچز نے برطانیہ اور شمالی آئرلینڈ میں دفاتر کھولے۔ یہی سبب ہے کہ میں "یہودیوں اور مسیحیوں کی بین الاقوامی کونسل" کے اِس اقدام پر خوش ہوں کہ اس نے سلامانکا (ہسپانیہ) میں ماضی کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تجربے سے استفادے کے لیے یہودیوں، مسلمانوں اور مسیحیوں کے درمیان مذہبی اور ثقافتی ربط و تعلق کا اہتمام کیا ہے۔ حال ہی میں اس گروپ نے "ابراہیمی فورم" (Abrahamic Forum) قائم کیا ہے۔ ۱۹۹۱ء میں خلیجی جنگ کے زمانے میں ہم نے نیدرلینڈ میں مسلمانوں، مسیحیوں اور یہودیوں پر مشتمل ایک جماعت بنائی جس کی سربراہ ایک یہودی خاتون تھیں، پاکستانی نام کی ایک مسلمان خاتون سیکرٹری اور میں — ایک مسیحی — شریک سربراہ تھا۔

۱۹۹۲ء میں ہم نے ہسپانیہ سے یہودیوں اور مسلمانوں کے اخراج (۱۴۹۲ء) [کی پانچ صدیاں پوری ہونے پر] اس واقعے کو نمایاں کیا۔ اس طرح ایک دوسرے کے بارے میں اپنے تاثرات کو درست کرنے کی کوشش کی اور "سامیت مخالف" اور "اسلامیت مخالفت" رویوں کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ اسلامیت مخالف جذبات اکثر نسل پرستی اور مسلم بیزاری میں لپٹے ہوتے ہیں۔ "یورپی چرچوں کی کانفرنس" کی جانب سے ایک رپورٹ تیار کرائی گئی اور مجھے تجزیے کے لیے کہا گیا۔ اس رپورٹ سے واضح ہوا کہ چرچوں میں یہودیوں کے ساتھ مکالمے کو مسلمانوں کے ساتھ مکالمے کی نسبت کہیں زیادہ ترجیح حاصل ہے، مگر جیسا کہ میں نے کہا، یہ صورتِ حال بتدریج بدل رہی ہے۔ مختلف علوم سے دلچسپی رکھنے والے ماہرینِ الٰہیات اسلام پر زیادہ توجہ دے رہے ہیں۔

یورپ سے باہر رہنے والے مسیحیوں اور مسلمانوں کے لیے صحیح صحیح یہ جاننا مشکل ہے کہ یورپ میں مسلمانوں اور اسلام کے ساتھ چرچ کا رویّہ کیا ہے۔ مثال کے طور پر مشرقِ وسطیٰ کے مسیحی ہمیں مسلمانوں کو اہمیت دینے اور ناقابلِ استعمال چرچ ترک اور مراکشی مزدوروں کو "بخش دینے" کا ملزم قرار دیتے ہیں۔ یورپ سے باہر رہنے والے مسلمان مصنفین چرچوں اور مسیحیوں کے دوستانہ پن اور اُن کے پوشیدہ ایجنڈے سے اپنے ہم مذہبوں کو خبردار کرتے ہیں۔ ایک مصنّف نے لکھا ہے کہ "موتمرات" (کانفرنسیں) "موامرات" (سازشوں) کو چھپائے ہوئے ہیں۔ خوش قسمتی سے ایک شامی مسلم عالم ڈاکٹر بسام طیبی[۶] نے، جو جرمنی میں مقیم ہیں، مسلم فکر میں مغرب کو اسلام کے خلاف سازشوں میں مصروف دیکھنے اور اسی طرح مغربی فکر میں اسلام کو مغرب کے خلاف سازشی سمجھنے کی لایعنی کہانی کی حقیقت واضح کی ہے۔ اس کے برعکس "ٹائم" اور "نیوز ویک" جیسے مؤثر ہفت روزوں نے صورتِ حال خراب تر کی ہے۔ ان جرائد نے یورپ میں اسلام کی موجودگی پر کسی ثبوت یا تحقیق کے بغیر ایسے مقالات شائع کیے ہیں جن کے مطابق مسلمانوں اور مسیحیوں کے درمیان عہدِ وسطیٰ کی قدیم نفرت تاحال پوری شدت سے موجود ہے۔ ان جرائد نے جھوٹ پر مبنی اپنے مضامین کے خلاف میرے احتجاجی خطوط شائع نہیں کیے۔

حالیہ برسوں میں یورپ میں مسلمانوں کو اپنے معاشرے کا حصّہ بنانے پر متعدد نئی کتابیں اور مقالات لکھے گئے ہیں۔ کتاب Muslims in the Margin[۷] میں ۸۰ مقالات کا اندراج ہے۔ بعض علمی کتابیں اِس عمل میں یورپی چرچوں کے کردار پر روشنی ڈالتی ہیں، مثال کے طور پر جے۔ نیلسن کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کتاب Islam in West Europe لیکن لیڈن یونیورسٹی کے دو مصنّفین واصف عبدالرحمٰن شدید اور پی۔ ایس۔ فان کوننگز ویلڈ کی مؤلفہ و مرتبہ پانچ کتابوں میں چرچوں کا یہ کردار نظر انداز کر دیا گیا ہے۔
اگرچہ یورپ کی نیو۔ لبرل اور سیکولر فضا میں مذہب ایک ضمنی مسئلہ بن گیا ہے، مگر اسلام ایک سیاسی حقیقت کے طور پر زیادہ توجہ حاصل کرتا ہے۔ صرف مسیحی روزنامے (جو کچھ زیادہ نہیں رہے) مذہب اور مسیحی۔ مسلم تعلقات کو اہمیت دیتے ہیں۔

اس تناظر میں منفی رجحان کے واقعات اخبارات میں زیادہ توجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ عنصر اسلام سے خوف جیسے احساسات میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ مثال کے طور پر حال ہی میں ایک مقالہ سامنے آیا ہے جس میں دہشت گردی، تشدّد اور سیاحت کے باہمی تعلق پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ مصر میں سیاحوں پر حملوں کے نتیجے میں وہاں جانے والوں کی تعداد میں ۲۵ فیصد سے زیادہ کی کمی آ گئی ہے۔ دو ڈچ محقق اپنی تحقیقات میں واضح کرتے ہیں کہ ہسپانیہ میں باسق باغیوں اور میامی (فلوریڈا) میں امریکی جرائم پسند افراد کے ہاتھوں اس عرصے میں مرنے والے سیاحوں کی تعداد مصر میں نشانہ بننے والوں سے کہیں زیادہ تھی، مگر ہسپانیہ جانے والے سیاحوں کی تعداد میں کوئی کمی نہیں آئی، بلکہ ہسپانیہ جانے والے ڈچ سیاحوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ اس سے صرف یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ مصر کے معاملے میں سیاحوں کے قتل کو اسلام کے منفی امیج سے جوڑ دیا گیا ہے۔ یہ چیز امریکہ یا یورپ سے آنے والے سیاحوں کی نظر میں مصر کو ایک واقعی خطرناک ملک بنا دیتی ہے۔ چرچ پریس کو اپنی سرگرمیوں سے آگاہ رکھنے میں بھی کچھ فعّال نہیں ہیں۔ سیکولر لوگ گزشتہ چار عشروں میں نقل مکانی کر کے آنے والے مسلمانوں کے بارے میں چرچوں سے منفی روّیے کی توقع رکھتے ہیں، بلاشبہ انفرادی طور پر بعض پادریوں اور چرچ سے وابستہ افراد میں منفی روّیے موجود بھی ہیں۔ جرمنی یا یونان میں ایک مینار تعمیر کرنے یا اس سے اذان نشر ہونے پر اسلام مخالف جذبات فوراً سامنے آ سکتے ہیں، لیکن چرچوں کی قیادت نے ایسے منفی روّیوں کی شدت کم کرنے کے لیے بیانات دیے ہیں۔ جرمن چرچوں نے "اسلام کے بارے میں ہر ایک کو کیا جاننا چاہیے" کے عنوان سے ایک پمفلٹ کے تیس لاکھ نسخے تقسیم کیے ہیں۔ فرانسیسی اور ڈچ چرچوں نے بھی اسی قسم کے پمفلٹ بانٹے ہیں۔ اشاعت سے پہلے یہ پمفلٹ مسلمان دوستوں نے نہایت احتیاط سے پڑھ لیے تھے۔ چرچوں سے تعلق رکھنے والوں میں ایک مسئلہ جس پر بہت بحث کی جا رہی ہے، مشن کا تصوّر ہے۔ جب میں پاکستان سے واپس وطن گیا تو متعدّد افراد نے مجھ سے پوچھا: "پاکستان میں آپ نے کتنے مسلمانوں کو مسیحی بنایا ہے؟" کچھ دوسرے افراد نے مجھ سے اور میرے رفقائے کار سے کہا کہ چرچ سے وابستہ افراد کی تنظیم اور تربیّت کی جائے تاکہ وہ مراکش اور ترکی سے آنے والے مزدوروں کو حلقۂ مسیحیّت میں لا سکیں۔ ان سوالوں کا جواب دیتے ہوئے میں نے واضح کر دیا کہ جس طرح ہم نے یہودیوں کو حلقۂ مسیحیّت میں لانے کا کام چھوڑ دیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے، اِسی طرح مسلمانوں کی مذہبی سچائی کے احترام میں ہمیں ان کا مذہب بدلنے کی سعی ختم کر دینا چاہیے۔ مزید براں ہمیں ہمیشہ مذہبی آزادی کا احترام کرنا چاہیے۔ ہم نے یہ صداقت مان لی ہے کہ کچھ یورپی مسیحیوں اور دوسروں نے اسلام کو اپنے لیے "خدائی رہنمائی" کے طور پر قبول کیا ہے، اسی طرح ہمیں اِس امکان کے لیے چشم براہ رہنا چاہیے کہ بعض مسلمان دائرہ اسلام میں مطمئن نہیں اور مسیحی بننا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں کا چرچ میں خیر مقدم کیا جانا چاہیے۔ شاید بعض پاکستانی مسیحیوں کو یاد ہو گا کہ ۱۹۷۵ء کے لگ بھگ جہلم میں "کونسل آف چرچز اِن پاکستان" کی ایک کانفرنس میں میں نے اِسی نقطۂ نظر کا دفاع کیا تھا۔ میرے چرچ کی سنڈ کے لیے یہ نقطۂ نظر تسلیم کر لینا آسان نہ تھا، مگر اس نے طویل مباحثوں اور نجی ملاقاتوں کے بعد بالآخر اِسے تسلیم کر لیا۔ اِسی قسم کے مباحثے دُنیا بھر میں دوسرے چرچوں میں ہوئے ہیں۔ ان مباحثوں میں تعاون کے لیے ہم نے اپنے مسلمان دوستوں کو ساتھ رکھا ہے، تاہم اِس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کہ یورپ میں ایسے متعدد مسیحی گروہ ہیں جو آج بھی مسلمانوں اور یہودیوں کو حلقۂ مسیحیت میں لانے کی خاطر کوشاں ہیں، مگر جب میں اُن سے ریڈیو، ٹیلی وژن یا اخبارات میں بحث کرتا ہوں تو میں اُن سے اتفاق نہیں کرتا، لیکن اُن کی آزادیٔ رائے اور مسیحی دیانت و امانت کا احترام کرتا ہوں۔ مجھے دیانت داری سے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ جب میں ۱۹۶۴ء میں پہلی بار پاکستان آیا تو بڑی حد تک اِن ہی خیالات کا اسیر تھا۔ ہم نے مسلمان فریق میں بھی ایسے ہی مسترد کرنے دینے والے خیالات پائے ہیں، لیکن ہمیں ہر وقت اپنے مذہب کے اُن لوگوں کے ساتھ یہ مباحثہ دوبارہ جاری کرنے کے لیے تیار ہونا چاہیے جن سے ہمیں مکمل طور پر اختلاف ہے۔

اپنی بات سمیٹتے ہوئے آرچ بشپ آف کنٹربری جارج کیری کے کچھ الفاظ نقل کرتا ہوں جو اُنھوں نے اکتوبر ۱۹۹۵ء میں جامعہ الازہر - قاہرہ میں خطاب کرتے ہوئے کہے تھے^۸۔ بشپ کیری نے رویّے تبدیل کرنے والے چار موضوعات پر گفتگو کی۔

— عداوت نہیں دوستی

— لاتعلقی نہیں مفاہمت

— امتیازیت نہیں برابری کے باہمی تعلقات

— محاذ آرائی نہیں تعاون

لیکن [سوال یہ ہے] کہ مسلمانوں کا یورپ کا تجربہ کیسا ہے؟ ڈاکٹر شمائل بالچ، بوسنیا میں جو کچھ ہوا ہے، اِس کے باوجود یہ دکھاتے ہوئے نہیں تھکتے کہ اسلام Europe -conform (یورپ سے ہم آہنگ) ہے۔ علی کیتانی کے سامنے بوسنیا اور آسٹریلیا کے دو منظر نامے ہیں۔ آخر الذکر ملک میں مسلمان برادری کو معاشرے کا حصّہ بننے کے لیے اس کی حوصلہ افزائی کی جائے گا اور اِس کے حقوق تسلیم کیے جائیں گے۔ یورپی مشترکہ منڈی کے بعض ملک ڈرتے ڈرتے آہستہ روی سے اِس جانب بڑھ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رہے ہیں، مگر زیادہ تر کا رویہ ایسا نہیں۔"

یورپ میں مقیم اکثر مسلمان مزدوروں کے لیے یہ بحث کوئی معنی نہیں رکھتی کہ یورپ "دارالحرب" ہے یا "دارالاسلام"، کیونکہ اپنے ملکوں کو واپس جانے کا وہ کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔

باہمی تعاون میں کیا رکاوٹیں ہیں؟

آج بنیاد پرستی — یہودی، مسیحی، مسلم اور ہندو بنیاد پرستی وغیرہ — پر بہت بحث و مباحثہ ہو رہا ہے۔ بنیاد پرستی کو ربط و تعاون کے خلاف ایک رکاوٹ سمجھا جاتا ہے، اگرچہ کچھ مستثنیات بھی موجود ہیں۔ ہم اسرائیل میں یہودی آبادکاروں، الجزائر میں اسلامک فرنٹ، ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی "بائبل بیلٹ" (انجیلی خطّے) کے مخصوص مسیحی گروہوں، یا ہندو گروہوں کے بارے میں سوچ سکتے ہیں جنھوں نے ہندوستان میں اجودھیا (یو۔ پی) کی بابری مسجد مسمار کر دی۔ اس صورت حال کے مطالعے کے لیے یونیورسٹی آف شکاگو نے تصنیف و تحقیق کا ایک پروجیکٹ — "بنیاد پرستی پروجیکٹ" — شروع کیا ہے[9]۔ اِن گروہوں کے درمیان متعدّد باتیں مشترک ہیں۔

۱۔ وہ معاشرے میں تمام شرکاء کی مساوی حیثیت کی بنیاد پر تکثیریت تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ اپنے گروہ کو برتر اور زیادہ حقوق کا مالک خیال کرتے ہیں۔

۲۔ وہ اپنے مخالفین کو خداوند کا دشمن سمجھتے ہیں۔ (یہ رویّہ ذاتِ خداوندی اور خداوند کی مرضی و ارادہ کے بارے میں اُن کے تصوّر پر مبنی ہوتا ہے۔)

۳۔ اُن کے نزدیک ارادۂ خداوندی کی اُن کی اپنی تعبیر و تشریح اُس ملک کے دستور سے زیادہ اہم ہے جس میں وہ زندگی گزار رہے ہیں۔

۴۔ دوسرے مذہبی گروہوں کو تسلیم نہ کرنے کا رویّہ — وہ اکثر تشدّد پر اتر آتے ہیں۔

۵۔ وہ اکثر ماضی کو آئیڈیل بنا لیتے ہیں جس کو دوبارہ لوٹانا ممکن نہیں۔

صورت حال کا جائزہ لینے پر سوال کیا جا سکتا ہے: عملاً کیا کیا جانا چاہیے؟ اقلیتوں کو معاشرے سے کاٹ دینے کا نتیجہ انتہا پسندانہ رجحانات کی شکل میں سامنے آتا ہے، بالخصوص بے روزگار نوجوانوں میں جو اپنے آپ کو کم تر خیال کرتے ہیں۔

یورپی تناظر میں میں تین تجاویز پیش کرتا ہوں:

۱۔ ۱۹۹۵ء میں ہیمبرگ میں کلیساؤں کے کنونشن (جسے جرمنی میں Kirchentag کہا جاتا ہے) میں ایک لاکھ ۲۵ ہزار افراد شریک ہوئے، میں نے اس کنونشن میں یورپ کے چرچوں اور تمام مساجد کے درمیان "شراکت" کی تجویز پیش کی تھی۔ کنونشن کی سرکاری رپورٹ میں میری تجویز چھاپ دی گئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس قسم کی شراکت سے مسلمانوں اور اُن کی جائیداد پر اسلام کے خوف سے ہونے والے حملوں کے روکنے میں مدد مل سکتی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۲- ایک دوسرے کے وجود کو تسلیم کرنے کی کلید تعلیم ہے۔ تعلیم تک سب کی رسائی ہونا چاہیے اور اقلیتوں سے تعلق رکھنے والوں کے لیے حصولِ کار کی مواقع کھلے ہونے چاہییں۔ ۲۱ نومبر ۱۹۸۷ء کو جرمنی میں مسلمانوں اور مسیحیوں پر مشتمل ایک گروپ نے ایک تحقیقی پروجیکٹ —— "سکولوں کی نصابی کتابوں میں اسلام" —— پر کام شروع کیا۔ پورے یورپ کو احاطہ کیے ہوئے یہ پروجیکٹ فروری ۱۹۹۳ء میں مکمل ہوگیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ رواداری اور تعلیم کو باہم دگر ملایا جائے اور اسلام کے بارے میں غلط اطلاعات ختم کی جائیں۔ مقصد یہ تھا کہ تمام درسی کتابوں (کی اشاعت ہای جدید اور نئی کتابوں) کی تصحیح ہوجائے۔

اس سے ملتا جلتا ایک پروجیکٹ ترکی میں الٰہیات کی نصابی کتابوں کے بارے میں مکمل کیا گیا ہے۔ یہ معلوم کرنے کی خاطر اِن کتابوں کی چھان پھٹک کی گئی کہ کیا ان میں مسیحیت کے بارے میں صحیح اطلاعات ہیں۔ ایسی مسیحیت نہیں جیسی مسلمانوں کی نزدیک ہونا چاہیے، بلکہ اس طرح کی، جیسی خود مسیحی سمجھتے ہیں۔ اِس کا نتیجہ ہے کہ ۱۹۸۶ء سے تمام دینیاتی شعبوں میں مسیحی پروفیسر تدریسِ مسیحیت کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ ڈاکٹر تھامس مچل کی لکھی ہوئی نئی نصابی کتاب عربی، فرانسیسی اور ترکی میں شائع ہوچکی ہے اور عنقریب انگریزی میں شائع ہوجائے گی۔ اسی طرح یورپ میں ۱۹۸۷ء میں ہم نے ایک پروجیکٹ شروع کیا، تاکہ پادریوں کے تمام تربیتی دینیاتی اداروں میں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں بہتر تعلیم دی جاسکے۔ ہماری رپورٹ انگریزی، فرانسیسی، جرمن، اطالوی، روسی اور ڈچ زبانوں میں مکمل، اور ہسپانوی میں جزوی طور پر شائع ہوچکی ہے۔ اِس رپورٹ کی متعدد سفارشات میں سے ایک یہ ہے کہ سیمنریوں اور دینیاتی اداروں کے تربیتی کورسوں میں مسلمان اساتذہ کو مدعو کیا جائے۔ ۱۹۹۱ء میں ہماری برمنگھم کانفرنس میں لندن کے "مسلم کالج" کے ڈاکٹر زکی بداوی نے ہمیں بتایا کہ اُن کے کالج میں زیرِ تربیت ائمہ مساجد کو مسیحیت کے بارے میں مسیحی اساتذہ لیکچر دیتے ہیں۔ اس انداز سے ہم ایک دوسرے سے ذمہ دارانہ سلوک کریں گے۔ اِس پروجیکٹ کے تحت ایسی کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں اسلام کو ایک برادرانہ عالمی مذہب کے طور پر دیکھا گیا ہے جس کا اپنے طور پر ایک ترقی یافتہ علمِ الٰہیات ہے۔ اِس کے برعکس یورپ میں لوگ مسلمانوں کے بارے میں اکثر یہ سمجھتے ہیں کہ ایک نسلی گروہ دوسرے ملک میں کچھ ازکار رفتہ مذہبی رسموں اور رواجوں کے تحفظ کے لیے اپنے اماموں کی سربراہی میں کوشاں ہے، اور یہ امام میزبان ملک کی زبان تک نہیں بول سکتے۔ یہی سبب ہے کہ اماموں کی تربیت اولیں درجے کا مسئلہ بن گیا ہے۔ جرمنی اور ہالینڈ میں ہم نے ترک ائمہ، جرمن/ڈچ پروٹسٹنٹ اور کیتھولک پادریوں کی مشترک کانفرنسوں کا اہتمام کیا ہے۔

۳- ربط و تعلق، تبادلۂ خیال اور مصالحت کی کوششیں

جون ۱۹۹۷ء میں تمام یورپی چرچ گراز (آسٹریا) میں اپنی دوسری اقوامانی یورپی اسمبلی منعقد کریں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گے جس میں ہزاروں افراد کی شرکت متوقع ہے۔ غیر مسیحی مذاہب سے متعلق پروگراموں میں مسلمان علماء شامل ہوں گے۔ اسمبلی کا موضوع "مصالحت" ہے۔ یورپ کئی تنازعات سے ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا ہے۔ اِن تنازعات کو آپ نسلی، سیاسی، سماجی، اقتصادی، قومی اور مذہبی تنازعات کا نام دے سکتے ہیں۔ دوسری عالمی جنگ کے پچاس سال بعد جرمن اور پول (پولینڈ کے باشندے)، چیچن اور روسی سنجیدگی سے ایک دوسرے سے بات کر رہے ہیں کہ ماضی میں کہاں غلطی ہو گئی تھی۔ سربیا کے آرتھوڈوکس چرچ کی دینیاتی فیکلٹی میں منعقدہ یورپی چرچوں کی ایک کانفرنس (۱۹ - ۲۲ فروری ۱۹۹۶ء) میں کہا گیا: "یہ انسانی تنازعے کی خاصیت ہے کہ فریق مخالف کو ملزم، جارح اور ظالم بتایا جاتا ہے، جبکہ ہر فریق اپنے آپ کو مظلوم سمجھتا ہے۔" [۱۹۹۷ء میں] سالِ نو کے پیغام میں پوپ جان پال دوم نے کہا تھا کہ معافی چاہنا اور معاف کرنا بہت مشکل امر ہے۔ حقیقت میں یہ خدا کی توفیق ہے کہ انسان اِس قابل ہو، لیکن جب ایسا ہوتا ہے تو یہ اُمید کی کرن ہے۔ یہ ایک نیا آغاز ہوتا ہے۔ بائبل اور قرآن دونوں میں حضرت یوسف اور اُن کے بھائیوں کی کہانی موجود ہے۔ جب حضرت یوسف نے بن یامین کی بوری میں چاندی کے پیالے سے اپنے بھائیوں کے اخلاص کا امتحان لے لیا تو حضرت یوسف نے اُنھیں معاف کر دیا۔ میں پیدائش کے باب ۴۵ کے ساتھ [سورۂ یوسف: ۸۹ - ۹۲] کا اقتباس پیش کرتا ہوں:

> ---وہ چونک کر بولے "ہائیں! کیا تم یوسف ہو؟" اُس نے کہا "ہاں، میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے۔ اللہ نے ہم پر احسان فرمایا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی تقویٰ اور صبر سے کام لے تو اللہ کے ہاں ایسے نیک لوگوں کا اجر مارا نہیں جاتا۔" اُنہوں نے کہا "بخدا کہ تم کو اللہ نے ہم پر فضیلت بخشی اور واقعی ہم خطار کار تھے۔" اُس نے جواب دیا، "آج تم پر کوئی گرفت نہیں، اللہ تمہیں معاف کرے، وہ سب سے بڑا رحم فرمانے والا ہے۔"

بھائیوں کو اپنے بوڑھے باپ کے سامنے بھی اپنے گناہوں کا اقرار کرنا پڑا، جس سے اُنھوں نے جھوٹ بولا تھا۔ سورۂ یوسف کی آیت ۹۷ کا ترجمہ ہے۔

> سب بول اٹھے۔ "ابا جان! آپ ہمارے گناہوں کی بخشش کے لیے دعا کریں، واقعی ہم خطار کار تھے۔"

پس والد حضرت یعقوب نے معاف کر دیا۔ مسیحی اور مسلمان خداوند کی صلح صفائی کی ماہیت کے بارے میں باہم اختلاف کر سکتے ہیں، لیکن بنی نوع انسان کی حیثیت سے مصالحت کی ضرورت کے بارے میں اُن کے درمیان کوئی اختلاف رائے نہیں ہو سکتا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حواشی

۱- کتاب کے تعارف و تبصرہ کے لیے دیکھیے: ماہنامہ عالمِ اسلام اور عیسائیت"، جنوری ۱۹۹۵ء، صفحات ۲۸-۳۲

۲- فلسطینی مسیحی مصنف ایڈورڈ سعید نے اپنی تحریروں میں مستشرقین پر عمومی تبصروں کے ساتھ مستقل بالذات کتاب Orientalism (اولیں اشاعت: ۱۹۷۸ء) میں اُن کے "کارناموں" کا جائزہ لیا ہے۔

۳- دیکھیے: ڈاکٹر اے- ایل- طباوی کی کتاب English Speaking Orientalists جس کے کچھ ابواب سہ ماہی The Islamic Quarterly (لندن) میں شائع ہوئے ہیں۔

۴- پروفیسر ڈبلیو- منٹگمری واٹ انگریزی بولنے والے ملکوں میں نبی اکرم ﷺ کی سیرت اور ابتدائی اسلامی تاریخ پر سند سمجھے جاتے ہیں۔ اُن کا انداز نظر ماضی کے مستشرقین سے مختلف ہے، تاہم مسلمان اہلِ علم اُن کی تالیفات سے مطمئن نہیں۔ اسلام، مسیحیت اور مستشرقین کے حوالے سے دیکھیے:

* Islam and Christianity Today, London: Routledge and Keganpal, 1983

*The Study of Islam by Orientalists, Islamochristiana ، روم، شمارہ ۱۴ (۱۹۸۸ء)، صفحات ۲۰۱-۲۱۰

۵- کتاب کے تعارف و تبصرہ کے لیے دیکھیے: ماہنامہ "عالمِ اسلام اور عیسائیت"، جنوری ۱۹۹۶ء، صفحات ۳۰-۳۱

۶- بسام طیبی عربی، جرمن اور انگریزی میں لکھتے ہیں۔ عالمِ اسلام میں احیائے دین کی حالیہ لہر کو، وہ عالمی سطح پر ہونے والی اقتصادی اور سیاسی تبدیلیوں کے خلاف مسلمانوں کا دفاعی ردِعمل سمجھتے ہیں۔ اُن کی خواہش ہے کہ ہر معاملے میں اسلام کا حوالہ نہ دیا جائے اور مسلمان سیکولرزم کو بہ دل و جان اپنا لیں۔ بسام طیبی کی انگیزی میں دستیاب چند کتابیں یہ ہیں:

* The Crisis of Modern Islam: A Per-industrial Culture in Scientific Technological Age, Salt Lake City: University of Utah Press, 1988.

* Arab Nationalism: A Critical Enquiry, London: Macmillan, 1990

* Islam and the Cultural Accomodation of Social Change, Boulder: Westview Press, 1991.

* The Challenge of Fundamentalism: Political Islam and the

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

New World Order, Berkeley: University of California.

۷- واصف عبدالرحمٰن شدید اور کو ننگز ویلڈ کی مشترکہ کاوش کا پورا نام ہے- Muslims in the Margin: Political Responses to the Presence of Islam in Western Europe

۸- آرچ بشپ آف کنٹربری جناب جارج کیری کے خطاب کے لیے دیکھیے: ماہنامہ "عالمِ اسلام اور عیسائیت"، ستمبر ۱۹۹۶ء، صفحات ۱۷-۲۶

۹- جناب مارٹن ای - مارٹی اور سکاٹ اپیل بی کی نگرانی میں اس پروجیکٹ کے تحت پہلی کتاب Fundamentalisms Observed ۱۹۹۱ء میں شائع ہوئی، اُسی سال دوسری کتاب خلیجی جنگ (۹۱-۱۹۹۰ء) کے تناظر Islamic Fundamentalism and the Gulf Crisis (مرتبہ: جیمس پسکیٹوری) کے نام سے چھپی ہے-

© rasailojaraid.com